باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراث پدر کیوں کر ہو

مدارسِ اسلامیہ کا نصاب ونظام
اور جدید تقاضے

تالیف:

محمد طاہر جمال ندوی

ناشر:

دار البحوث و المناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش۔

کتاب : مدارس اسلامیہ کا نصاب ونظام اور جدید تقاضے۔
مؤلف : مولانا محمد طاہر جمال ندوی، فاضل دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا۔
باراول : دسمبر:۲۰۲۲ء
تعداد : ۱۰۰۰ (ایک ہزار)
قیمت : ۱۰۰/ ٹاکا، بنگلہ دیشی۔۵/ریال سعودی
کمپوز : محمود العالم (اندرقلعہ، چاٹگام، بنگلا دیش)
ناشر : دار البحوث والمناصرۃ الاسلامیۃ چاٹگام، بنگلا دیش

ملنے کے پتے : 0088-01533091784
Email : tahernadwi@gmail.com

انتساب:

خاکسار اپنی اس حقیر کاوش کو اپنے والدین کریمین اور اپنے جملہ اساتذۂ کرام کے نام انتساب کر پانے کو بڑی سعادت محسوس کر رہا ہے، اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالی اپنے خاص فضل وکرم سے ان تمام بزرگوں کی مغفرت کے ساتھ ان کے مراتب کو بلند فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

خاکسار:

محمد طاہر جمال ندوی

۱۹/جون/۲۰۲۲ء

چاٹگام، بنگلادیش۔

فہرست عنوان

حرفِ اولین:

ہر کسی کو یہ حقیقت سورج کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ دورِ حاضر میں ہمارے دینی مدارس کے مشائخ، علمائے کرام، اساتذہ اور طلباء اصحابِ صفہ کے امین اور علوم نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثین ہیں، اور دینی مدارس اسلام کے وہ قلعے ہیں جہاں سے قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک برحق، برمحل اور صحت پر مبنی بات ہے کہ یہاں پڑھائے جانے والا نصاب اور مروجہ نظام اس علاقے میں پائے جانے والے دیگر نظامہائے مدارس ونصاب تعلیم کے مابین ایک خصوصی امتیاز رکھتا ہے، یہی مدارس دینیہ علوم اسلامیہ کے فروغ کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں اسلامی تعلیم وتربیت کے فروغ اور افراد میں شعور وآگہی پیدا کرنے میں ہمیشہ اہم کردار ادا کرتے آرہے ہیں، اس حوالے سے پروفیسر فیوض الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اسلام کے قلعے یہی دینی مدارس تھے، جنھوں نے اس کے ناپاک اور مکروہ عزائم کو خاک میں ملا دیا، آج ہمیں برصغیر پاک وہند، بنگلا دیش، افغانستان اور دنیا بھر میں دین کے فیوض وبرکات کے جو نظارے نظر آتے ہیں، وہ ان ہی علماء، مشائخ اور مدارس کے طفیل ہیں''۔

لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ کے حالیہ نصاب ونظامِ تعلیم کی بعض خامیوں کے ساتھ ان کے ارباب بست وکشاد کی بعض کوتاہیوں کی وجہ سے یہاں کے فارغین ہمارے معاشرہ اور سماج کے لئے وہ فائدہ بخش عنصر نہیں بن پاتے، جوان

سے متوقع ہے، پھر اس سے بھی بڑی حسرت و یاس کی بات یہ ہے کہ مدارس کے فارغین اتنے سالوں تک ان میں پڑھنے کے باوجود ایک قسم کے طفیلیے نہیں بلکہ اصلاح کے حوالے سے کئے جانے والے ضروری اقدامات کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کبھی یہ ہمارے مدارس تھے، جنہوں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام محمد بن ادریس الشافعیؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ، پھر دور آخر میں اور تو اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ جیسوں کو پیدا کیا تھا، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد کے (خاکم بدہن اور گستاخی معاف) ان کے نام لیواؤں میں ان بزرگوں جیسے تو دور کی بات بلکہ حقیقی معنی میں ان کے خوشہ چین تک یہ مدارس شاید پیدا کر سکے، ہماری ان مخلوق میں ان بزرگوں کی جیسی وسعت نظری پائی جاتی ہے نہ جرأت افکار و مستحکم کردار۔ یوں لے دے کر ہمارے ان میں صرف اور صرف تقلید جامد ہی پائی جاتی ہے، اور تو اور ہر کجا ان لوگوں کی اکثریت غیر سائنٹیفک خیالات، مثبت کی جگہ منفی تصورات کے پھیلانے میں ایک قسم کے وسیلے بن جاتی ہے۔

خاکم بدہن اور گستاخی معاف! بات ذرا کڑوی سی ہے، لیکن حقیقت پہ مبنی ضرور، حقیقت اور واقعیت کے حوالے سے سنی جائے گی تو فائدے انشاء اللہ ضرور ہوں گے۔ ویسے پیش نظر میرے اس مقالہ کے مطالعے اور اس پر غور و خوض کرنے سے ہمارے دینی مدارس کے کارپردازوں کے سامنے ایک مثبت فکر اور آگہی آئے گی، اور امید ہے کہ یہ مقالہ ان کو اپنے مدارس کے نصاب کی تشکیل نو اور تدوین جدید اور نظام میں ضروری تبدیلی بشرطیکہ وہ تیار ہوں، ممد اور معاون ثابت ہوگا، انشاء اللہ تعالی۔ تاہم کسی کو شک نہیں رہنا چاہئے کہ زمانے کی بدلتی ہوئی صورت حالات کے پیش نظر ہمارے ان مدارس پر مثبت انداز فکر سے تنقید کرنے کی گنجائش بھی ضرور ہے۔

ساتھ ہی ساتھ دینی مدارس کے کارپردازان اور ذمے داران سے گزارش اور اپیل ہے کہ آپ حالات کی نزاکت اور موجودہ وقت کے تقاضوں کو سمجھیں، اور اپنے مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم میں ضروری تبدیلی یا تطویر کی گنجائش پیدا کریں، دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے خاص فضل و کرم سے ہمیں

سمجھنے، اور دوسروں کو صحیح بات سمجھانے کی توفیق سے نوازے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

خاکسار:

محمد طاہر جمال ندوی

۱۹/ جون/۲۰۲۲ء

چاٹگام، بنگلادیش۔

مدخل:

قرآنِ کریم میں سیدنا آدم علیہ السلام کے مسجودِ ملائک ہونے کے استحقاق کی وجہ کائنات کا علم بتایا گیا ہے، چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: **وعلم آدم الاسماء کلھا**، یہاں **کلھا** کی قید بطور خاص ناظرین کرام کے پیشِ نظر رہے۔

اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دینِ اسلام ایک مسلمان کی زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا ہے، جس پر اس کی دنیاوی اور اخروی فلاح وکامرانی موقوف ہے، یوں دینی علوم وفنون کے ساتھ اس کے مدد ومعاون تمام علوم وفنون سے مسلمانوں کا دلچسپی لینا اور ان سے شغف رکھنا ایک امرِ طبیعی ہے، علاوہ ازیں قرآن کریم میں جگہ جگہ عالمِ کائنات کو اللہ تعالیٰ کی آیات کہا گیا ہے، اور جن پر غور وفکر کی خاص دعوت دی گئی ہے۔

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین، سمندر، جمادات، نباتات، حیوانات اور اسی طرح کی دیگر مخلوقات (جیسے سورج، چاند، ستارے اور سیارے) سب انسان کی نفع رسانی اور خدمات کے لئے پیدا کئے ہیں، چناں چہ فرمایا ہے کہ: **وسخر الشمس والقمر دائبین**۔

اسی وجہ سے مسلمانوں میں ان کے متعلق علوم وفنون کے حاصل کرنے کا شوق وولولہ پیدا ہوا تھا، علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ اسلام ایک عالمی دین اور لازوال حقیقت ہے، اسی بناء پر مسلمانوں کو دنیا کی مختلف قوموں اور متنوع گروہوں کی زبان، تاریخ، ثقافت، تمدن اور فلسفۂ زندگی سے بڑی حد تک دلچسپی لینا پڑا، جس کی وجہ سے مسلمانوں نے ابتدائی دور میں کبھی کسی زبان اور علم کو اپنے لئے شجرۂ ممنوعہ قرار نہیں دیا تھا، چناں چہ رسول انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے "**طلبوا العلم فریضۃ علی کل مسلم**" کے ساتھ فرمایا ہے کہ: "**اطلبو العلم ولو کان با الصین**"

علاوہ ازیں ہم اپنے بعض تاریخی مصادر میں دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا

زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور سیدنا سلمان الفارسی سے بذاتِ خود ایرانیوں کا طریقِ جنگ دریافت فرمایا، پھر ملاحظہ کیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب باصفا میں سیدنا عمرو بن عاص اور عمران بن الحصین جیسے متعدد بزرگ تھے، جو اپنی مادری زبان عربی کے علاوہ دیگر متعدد زبانیں جانتے تھے۔

لیکن بایں ہمہ یاد رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے علم سے بھی پناہ مانگی، جو انسانیت کے لئے نافع نہ ہو، بلکہ مضر ہو، چناں چہ ارشاد ہے کہ: "**اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع**۔ یعنی وہ علوم جن کی بنیاد ظن وتخمین پر ہونے کے علاوہ معاشرہ کی تطویر وارتقاء میں ان سے کوئی مدد نہیں ملتی ہو۔

یوں ظاہر ہے کہ علم کا اصلی مقصد مخلوق کی نفع رسانی اور خدمتِ خلق ہے۔ اس ضمن میں یاد رہے کہ معرفتِ ربِ کائنات ہر مسلمان کے لئے لازمی امر اور اس کی ایمانی زندگی کے لئے ضروری ہے، کہ جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی بسر کر سکے، اور معاش حاصل کرسے، اس سلسلے میں یہ ارشادِ ربانی ذہن میں رہے کہ "**ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ**"۔

تو اسلام کے دستورِ اساسی کے بطور "**طلبو العلم علی کل مسلم**" کہا گیا ہے، اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ: "**اطلبو العلم من المھد الی اللحد**" یعنی علم کے معاملے میں یہ دستور کلیہ ہے، اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم خواہ قرآن وسنت کا ہو یا ریاضی، ہیئت اور جبر ومقابلہ کا، جو انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ہو اس کا حصول نہ صرف جائز ہے بلکہ لازمی بھی۔

ہمارا تعلیمی ادارہ:

امتِ مسلمہ کا ادارۂ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے بڑا اہم مظہر ہے، یہ ادارہ ایک طرف ان کے مذہبی تصورات وعقائد کے حوالے سے سب سے مؤثر تھا، تو دوسری طرف ان کی قومی تشکیل میں سب سے بڑی اثر انداز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارہ کا مقصد افراد کو ان کے ذوق واستعداد کے

مطابق زندگی کی گونا گوں وسعتوں کے لئے تیار کرنا اور ترقی پذیر گرد وپیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی استعداد پیدا کرنا ہے۔

چوں کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور اس ادارہ کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لئے جوں جوں ان کی ملی حیات میں جمود واضمحلال آتا گیا، توں توں ان کا ادارۂ تعلیم بھی جامد ومضمحل ہوتا گیا، مسلمانوں کے اس جمود واضمحلال کی داستان بڑی طویل ہے، جس کی طرف جانا سرِ دست گنجائش ہے اور نہ مناسب۔ تاہم اتنی سی بات بتا دیتا ہوں کہ مسلمانوں کے علمی تنزل کے علاوہ ان کا سیاسی واقتصادی زوال اس داستان کا ایک المناک باب ہے۔

غرض دورِ آخر میں مسلمانوں کے علوم وفنون کے جمود نے ان کا سب سے اہم قومی ادارہ تعلیم کو بالکل جامد بنا کر رکھ دیا ہے، ان کی درس گاہیں جو ان کی ترقی اور نشو ونما میں قابلِ قدر حصہ لے سکتی تھیں، زندگی اور زندہ روی کے تقاضوں سے دور ہوتی چلی گئیں، افسوس ہے کہ آج ہماری درس گاہیں نہ وقت کے نت نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہیں، اور نہ نئی فکروں اور نئی قدروں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ان درس گاہوں نے علوم وفنون میں دینی ودنیاوی تقسیم کو قبول کر کے اپنے آپ کو دینی علوم کی تعلیم میں محدود کر دیا ہے، اس حوالے سے آج کی فضاء اور ماحول کافی مسموم ہو چکا ہے، جس کا منطقی نتیجہ یہی نکلا کہ لوگوں کو دین سے کوئی خاص لگاؤ جیسا ہونا چاہیئے تھا نہیں رہا۔ ذہنی عقائد وتصورات میں وہ قوت باقی نہیں رہی جو امت مسلمہ کو زندگی کے میدان میں منظّم رکھ سکے، غرض ہمارے مدارس نے زندگی کو ایک کل کی شکل میں دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہے، یعنی زمانے کی عقل و دانش کو نا قابلِ اعتناء قرار دے کر عصری علوم وفنون سے ایک حد تک دیدہ ودانستہ اغماض کیا گیا ہے۔

ان امور کے حوالے سے ہمارے علمائے کرام کا فرض اولین تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے، اور حقیقی عوامل واسباب کو دریافت کر لیتے، مرض کے تعین کے بعد صحیح علاج ومعالجہ کی طرف توجہ مبذول کرتے، لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

آج دنیا میں سرسری نظر بھی ڈالیں گے تو آپ کو یہ حقیقت بالکل صاف نظر آئے گی کہ آج انسانی

زندگی اپنا چولا بدل چکی ہے، علوم وفنون کے زاویے بدل چکے ہیں، مسائل دگرگوں ہو گئے ہیں، طرز فکر اور اندازِ نظر نیا ہو گیا ہے، غرض ہر چیز قانونِ ارتقاء کے تحت ماضی سے کافی آگے نکل چکی ہے، اس حوالے سے ہمارے ماضی کے جن جن اداروں نے زندگی کا ساتھ دیا، اور اس کی ترقی و ارتقاء میں اپنا اپنا حصۂ واجبی ادا کیا، وہ باقی اور ترقی کرتے رہے، ان کے برعکس جو ادارے زندگی کا ساتھ نہ دے سکے انہیں لازماً ختم ہونا ہی پڑا۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کائنات کی ترقی پذیر روح کو جذب کئے بغیر کوئی بھی چیز زندہ نہیں رہ سکتی، ویسے ہماری ان پرانی درس گاہوں نے بدقسمتی سے قدرت کے ان اٹل قانون کی خلاف ورزیاں کیں، اس لئے وہ فنا ہو گئیں، یا کم سے کم فناء آمادہ ہیں، ان میں پڑھائے جانے والے علوم و فنون فرسودہ ہو گئے ہیں، طریقۂ تحقیق اور طرزِ تعلیم دونوں بوسیدہ ہو گئے ہیں، نہ یہ ہماری خارجی زندگی سے ہم آہنگ اور نہ داخلی زندگی کے مطابق ہیں، ان میں اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ زندگی کو اسلامی اصولوں پر معتدل ومتوازن بنانے کی قابلیت، غرض ہمارا تعلیمی ادارہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہو چکا ہے۔

تعلیم کا موضوع:

کون نہیں جانتا ہے کہ تعلیم کا موضوع طالب علم ہے، اس لئے تعلیم میں اس کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مناسبتوں کا خاص خیال کیا جانا ازبس ضروری ہے، علاوہ ازیں اس کی ذہنی الجھنوں اور کشمکشوں کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کے ساتھ ان کو حل یا دور کرنے کی طرف توجہ دی جانی ہے، تعلیم کا فائدہ تو طالب علم کے انفرادی واجتماعی رجحانات کو سدھار کر اسے سماج اور معاشرہ کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنانا ہے، اس ضمن میں یہ خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ طلباء میں تعمیری نقد کی حوصلہ افزائی ہو، اس طرح نہ صرف اس کی تخریبی قوتوں کی اصلاح ہو جائے گی، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کی داخلی الجھنوں اور کشمکشوں کی بھی تسکین ہو جائے گی، یوں اس طریقے اور حکمتِ

عملیوں سے اس کی دماغی ترقی اور فکری نشوونما ہوکر زندگی کے اس سفر میں وہ رواں دواں ہوجائیں گے۔

دنیا میں سب سے برتر وہ لوگ ہوتے ہیں جو دین کے علم میں ترقی کرتے ہوں، اس لئے یہ بات اچھی طرح یادرکھنا چاہیئے کہ اس عالمی اور بین الاقوامی دین کا معنی یہ نہیں ہے کہ آپ نماز وروزہ کے طریقے بتلا دیں، یادرہے کہ پوری کی پوری زندگی جو ہے وہ دین ہے، زندگی کی ہر حرکات و سکنات، ہر سانس وجنبش، ہر چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، ازدواجی اور عائلی تعلقات اور خاندانی سے لے کر سارے قومی امور دین کے ماتحت ہیں، اللہ تعالی کی خوش نودی اور رضا جوئی کا معنی یہ ہے کہ آپ خلقِ خدا کی خدمت کریں، انسانیت کے قافلہ کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں، اجتماع انسانی اور اس دنیا کی تہذیب وتمدن کو اپنے روشن کردار اور مثبت سرگرمیوں سے فائدے پہنچائیں، یوں اس نیت سے آپ بم بھی بنائیں تو یہ بھی عبادت اور یہ بھی دین ہے۔

درس کی اہمیت اور مقصد کی حفاظت:

ہمارے مدارس کے زیرِ درس مضامین میں اصل اہمیت کتابوں کو دی جاتی ہے، علوم کو نہیں، جب کہ کتابوں کی حیثیت ان یادداشتوں سے زیادہ کچھ نہیں کہ جن میں اساتذۂ کرام اور طلباء کی سہولت کے لئے متعین معیاروں کے تحت علمی مواد جمع کیا گیا ہو۔ اس حوالے سے یادرہے کہ بغیر خاص کسی ضرورت کے بس کتابوں کو موضوعِ درس بنالینا تعلیم کو مفید اور کامل بنانے کے بجائے غیر مفید اور ناقص بنانے کا مترادف ہے۔

اور جہاں تک مقصد کی حفاظت کا سوال ہے، تو ہمیں جاننا چاہئے کہ دینی نصاب کے مقاصد کیا ہیں؟ ہمارے یہاں نصابوں کی حفاظت پر زور تو دیا جاتا ہے مگر مقاصد پر بہت کم، مقاصد کی حفاظت کے بعد دراصل کتابوں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں۔ مقاصد کی حفاظت کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو کتابوں میں تغییر وتبدیلی کی جاسکتی ہے، اس حوالے سے حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری کا یہ بیان بطورِ استشہاد سن لیں کہ:

''خود مولانا انور شاہ کشمیری صاحب نے ڈابھیل میں جانے کے بعد جو نصاب بنایا تھا، شرح جامی کی جگہ پر ابنِ عقیل، شرح وقایہ کی جگہ پر شرح نقایہ، اصول الشاشی کی جگہ پر تعقید النظر.........بہت ساری تبدیلیاں لائی تھیں''۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر حقانی میاں قادری، دینی مدارس، ص:۲۳)

قرآن اور تفسیر قرآن کریم:

ہمارے دینی درس گاہوں کے موجودہ ومروجہ نصابِ تعلیم میں قرآنِ کریم کی تعلیم کو عملا مرکزی حیثیت نہیں رہی ہے، حالاں کہ دین اسلام کو سمجھنے اور اس کا عام میلان ومزاج دریافت کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ قرآنِ کریم ہے، ہمارے اس نصاب کے متعلق کہا جائے تو بات یہ ہے کہ یہاں قرآن مجید میں بلا واسطہ تدبر وتفکر کی راہیں بڑی حد تک مسدود ہیں، اس نصابِ درس میں اس کو مرکزی مقام ملنا بہت ہی ضروری تھا اور ہے، اس ضمن میں یادرہے کہ قرآن کریم میں بلا واسطہ تدبرو تفکر کی بڑی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔

ظاہر ہے کہ قرآن کریم دین اسلام کا اصل الاصول اور امتِ مسلمہ کا دستور العمل ہے، اور ہر زمان ومکان میں یہ شمعِ ربانی دائمی نصابِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس کے ترجمہ وتفسیر کی تعلیم پر خاص توجہ دینے کی بڑی ضرورت ہے۔

ادھر ہمارے اکثر مدارس میں تفسیرِ قرآنِ کریم کے بطور تفسیر جلالین پڑھائی جاتی ہے، اور کہیں کہیں تفسیر بیضاوی بھی، گوکہ تفسیر جلالین ہمارے مدارس کے نصاب میں داخل ہے، لیکن عملا اکثر مدارس میں اس کی تعلیم تکمیل تک نہیں پہنچتی، اور جہاں تک تفسیر بیضاوی کا تعلق ہے، وہ زیادہ سے زیادہ سورۂ بقرہ تک پڑھائی جاتی ہے۔

ادھر قرآن کریم کی بہت سی تفاسیر میں اسرائیلی روایات، واقعات وتلمیحات ہیں، کبھی عرب رفعِ استجاب کے تحت ان کے متعلق اور ان کے ماسواء ابتدائی زمانے میں خلق وغیرہ کے متعلق ان اہل

کتاب کی طرف (جو اسلام قبول کر چکے تھے) رجوع کیا کرتے تھے، یہ بزرگ اپنی معلومات کی بقدر (جو محدود اور بڑی حد تک عامیانہ اور غیر مستند ہوتی تھیں) ان واقعات اور تلمیحات کو یا دوسرے مفسرہ واقعات کو بیان کر دیتے تھے۔ یوں بہت سی وہ اسرائیلی روایتیں جن کے تذکرے سے بائبل کا عہد قدیم اور عہد جدید کے علاوہ تلمود بھی خالی ہے، قرآنی تفاسیر میں آ گئیں، اسی طرح کے واقعات بھی جو اگرچہ مرجہ بائبل میں موجود تھے، لیکن قرآن مجید نے ان کی تصدیق نہیں کی تھی، مسلمانوں میں آئے اور پھیل گئے۔

پھر دوسرے دور کے مفسرین نے اپنے مذاقِ طبع کی بناء پر قدیم تفاسیر یا قدیم تفسیری روایتوں سے جو چیزیں بلا پرکھے انتخاب کر لی تھیں، مابعد کے مفسرین نے ان کی حتمی شکل دی۔

پھر عقلی دور کے شروع ہونے کے بعد مختلف عقلی مفادوں کی حمایت کی بناء پر اکثر تفاسیر بھی فلسفیانہ تخیلات کی آماجگاہ بن گئیں، چناں چہ آج قرآن کی بعض تفاسیر کو یونانی دیو مالائی اوہام سے جدا کرنا مشکل نہیں بلکہ محال ہو گیا ہے، اسلام میں غیر عربی عناصر کے داخلے کے بعد تفسیریں لسانیاتی نقطۂ نظر سے بھی لکھنا شروع ہو گئیں، ان تفسیروں میں الفاظ کی نحوی، صرفی اور لغوی حیثیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

مدارس میں حدیث کی تعلیم:

ہمارے مدارس دینیہ میں احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طور پر دورہ ہوتا ہے، لیکن یہ دورہ فقہ حنفی اور اشعری علم الکلام کی روشنی میں پورا کر دیا جاتا ہے، اس لئے احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حیثیتیں جو اس فن شریف کے حوالے سے بہت ہی اہم اور ضروری ہوتی ہیں، وہ نظر انداز ہو جاتی ہیں، درحقیقت بات یہ ہے کہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تک شرحِ قرآن کا درجہ نہیں دیا جائے گا، تب تک ان کا صحیح اور برمحل فوائد حاصل نہیں ہوں گے، اس حوالے سے سید احمد اکبر آبادی صاحب نے جو لکھا ہے، وہ بڑا ہی فکر انگیز ہے اور قابل غور بھی:

’’سب سے بڑا نقص جس کی طرف شروع میں اشارہ بھی کیا چکا ہے، یہ ہے کہ حدیث کو بحیثیت اصل احکام پڑھایا نہیں جاتا، بلکہ اس کو فقہ کے تابع کر کے پڑھایا جاتا ہے، استاد جس مسلک کے فقہ کا پابند ہے، وہ احادیث کی تاویل و توجیہ اسی کے مطابق کرے گا‘‘۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، دینی مدارس، ص:۱۵۶۔

فقہ واصول فقہ:

حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اور تابعین کرام کے زمانے تک فقہ اسلامی میں بعد کی طرح مدرسی رنگ نہیں تھا، رواۃِ احادیث مجتہدین ہوں نہ ہوں ایسے مسائل میں جن کے متعلق ان کی مرویات میں صحیح احادیث موجود تھیں، ان کی سند پر فتوی دیا کرتے تھے، اور جن کے متعلق ان کی مرویات نہیں ہوتی تھیں، تو لوگوں کو اپنے سے زیادہ حدیث جاننے والوں کی طرف رہنمائی کر دیتے تھے، پھر اگر کسی مسئلہ کے متعلق مستند احادیث معلوم نہیں ہوتیں، تو مجتہدین منصوص مسائل پر قیاس کر کے فتوی دیا کرتے تھے۔

تابعین کرام کے آخری عہد سے مختلف مدارسِ اجتہاد قائم ہونا شروع ہو گئے، جن میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، پھر تیسری اور چوتھی صدی میں فقہ پر جب پوری طرح مدرسیت چھا گئی، اور مختلف مجتہدین کے اصول وفروع منضبط ہو گئے، تو لوگ کسی نہ کسی مجتہد سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے لگے تھے، تقریبا چھٹی صدی میں عام طور پر مجتہدین اربع امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مدارس اجتہاد تسلیم کر لئے گئے۔

فقہ اسلامی میں مدرسیت آنے کے بعد فقہی تصانیف میں بھی مدرسیت ناگزیر تھی، چناں چہ بالکل ابتدائی تصانیف کو چھوڑ کر عمومی فقہی تصانیف کسی نہ کسی خاص فقہی مدرسے سے متعلق ہو گئیں، اور رفتہ رفتہ فقہی کتابوں میں اجتہادی نقطۂ نظر بالکل فنا ہو گیا، اس حوالے سے یاد رہے کہ جب تک مختلف

مدارس کی ابتدائی کتابیں نہ ہوں، اس وقت تک پڑھنے والوں میں اجتہادی تخیل پرورش پا نہیں سکتا۔ دراصل فقہ آج ہمارے مدارسِ اسلامیہ میں تقلیدِ محض سے عبارت ہے، تعلیم کے آخری مرحلوں میں حقیقی تفقہ پیدا کرنا ہمارے نصاب کا مطمح نظر ہونا ناگزیر امر ہے۔

پھر ہمارے مدارسِ اسلامیہ میں فقہ واصول فقہ کی تعلیم میں نہ استنباط واجتہاد کو دخل ہے اور نہ فروع کے اصول پر انطباق کو، یہاں کی آب وہوا کا اثر سمجھئے یا علمائے ماوراء النہر کا طرزِ تفقہ (جن کے توسط سے فقہ واصول فقہ ہندوستان سے ہوکر ہمارے علاقے میں پہنچے، اور احناف کا مسلک ان علاقہ جات میں پھیل گیا) کہ یہاں ایک قسم کی شخصیت پرستی، متوارث خیالات بلکہ کسی قدر اوہام نہ صرف عوام کے دماغوں پر مسلط ہیں بلکہ بالعموم خواص بھی ان سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔

ہمارے حالیہ روایتی فقہ اسلامی کے حوالے سے تنقیدی نقطۂ نظر کے ساتھ لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا، اور کہنے والوں نے بہت ہی کچھ کہا ہے، زیادہ مطالعہ کی ضرورت ہوتو ہم ان کی تحریروں سے ضرور مستفید ہوسکتے ہیں، لیکن سر دست ان لکھنے والوں میں سے ایک مایۂ ناز عالم، قلم کار اور مفکر حضرت علامہ موسی جار اللہ کی ایک عبارت کافی معنی خیز اور بڑی حد تک غور طلب معلوم ہوتی ہے، ان کی باتوں پر غور کیا جائے تو بہت سارے فوائد مرتب ہوسکتے ہیں، چناں چہ علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ :

''علوم فقہ میں ''عبادات'' پر ایک حد تک مفصل ومکمل کام کیا گیا ہے، مگر معاملات میں معاشرتی وانفرادی حقوق اور ساتھ ساتھ انتظامی امور سے متعلق خصوصیات واحکام پر مدون شدہ فقہی علوم میں ابھی تک شاید اتنا کام ہوا ہو، یہی نہیں بلکہ کتب فقہ کے بعض ابواب میں جو کچھ ہے، اسے عملی جامہ پہنانا بھی ناممکن ہے، اور اسلام کے نظریۂ عدل سے بھی متصادم''۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مقالۂ علامہ موسی جار اللہ، دینی مدارس، ص: ۲۰۲)

علامہ صاحب آگے لکھتے ہیں کہ:

''رباء اور سود جیسے مسائل جو ابھی تک حل طلب ہیں، حلالہ ومتعہ جیسے مسائل جن کے رواجی پہلو اسلام کے چہرے پر شرمناک دھبے ہیں، اور شرعی حیلے جیسے مسائل جو کی تائید نہیں کرتیں؟ کتب فقہ میں بڑی کاوش سے فرضی مسائل تشکیل دیئے جاتے ہیں، لیکن معاشرتی نقطۂ نظر سے اہم ترین مسائل پر چپ سادہ لی جاتی ہے، یا بیان کرتے وقت ان کا حل پیش نہیں کیا جاتا ہے، آپ کے خیال میں کیا یہ سب چیزیں میری باتوں کا شاہد نہیں ہیں''۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مقالۂ علامہ موسی جار اللہ، دینی مدارس، ص: ۲۰۵)

یہ ایک سورج کی طرح عیاں حقیقت ہے کہ ہمارے مدارس کے نصابِ تعلیم میں عملاً فقہ کو اول درجہ یا اول مقام دیا گیا ہے، اور قرآن کریم کو حدیث نبوی صلوات اللہ وسلامہ کے بعد تیسرا درجہ، جب کہ دینی علوم میں جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ سب سے زیادہ اہمیت قرآن کریم کو دی جاتی تھی، پھر حدیث کو پھر فقہ کو۔ موجودہ ترتیب سے ظاہر ہے کہ طلباء کے ذہن میں فقہی اختلافات جنم پاتے ہیں، اگر طلباء کے دل ودماغ پر قرآنی علوم کی روشنی پہلے پڑ جائے، تو موجودہ اختلافات بہت کم ہوسکتے ہیں، جس سے اسلام اور امتِ مسلمہ کے بہت ہی فائدے ہوسکتے ہیں۔

غرض علوم دینیہ کے حوالے سے ہمارے مدارس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان پر نظر ثانی کی از حد ضرورت ہے، موجودہ زمانے میں جب کہ اصولِ فقہ، اصولِ حدیث اور اصولِ تفسیر پر اعلی سے اعلی کتابیں دستیاب ہیں، ایسے حالات میں اصول الشاشی، نور الانوار، نخبۃ الفکر اور الفوز الکبیر پر اصرار کرنا کہاں تک روشن ضمیری کی دلیل ہے؟

اس سلسلے میں یاد رہے کہ جوہر عقل نسل انسانی کا متاعِ مشترک ہے، اس میں تفاوت اور کمی بیشی کے باوصف دوسرے کی برتری کو فطرت انسانی بآسانی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، اس لئے یہ فقہی مذاہب، ماخوذ مسالک اور ذوقی مشارب شروع ہی سے محل اختلاف بنے رہے، یہ تینوں چیزیں تو ترجیحا پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن تبلیغا ان کو پیش کرنے کا کوئی منطقی جواز بطورِ خدمت دین

کلی طور پر نہیں نکلتا، ادھر جب سے ان کو تبلیغی درجہ دیا گیا، جس کی تاریخ بڑی لمبی اور داستان بڑی افسوس ناک ہے، تب سے ہی امتِ مسلمہ گونا گوں اختلافات اور مشکلات کی شکار بنتی رہی ہے۔

ہمارے دینی درس گاہوں میں جہاں تک نظر آتا ہے کہ اصول فقہ کا درس وتدریس بالکل مقصد سے دور ہو چکی ہے، جسے بامقصد بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے، فقہ واصول فقہ جس حیثیت سے مجروح ہیں، اور جو کتابیں موجودہ نصابِ درس میں شامل ہیں، وہ اس اعتبار سے نہایت مایوس کن ہیں کہ ان کی حیثیت محض ایک جامد اور تقلیدی فن کی ہو کر رہ گئی ہیں، جن سے استشہاد اور اخذ استنباط کا نہ ملکہ پیدا ہوتا ہے اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔

دراصل اصول فقہ سے مراد دلائل شرعیہ، قرآن وحدیث اور اجماع سے مسائل کا استنباط کرنا ہے، دوسرے الفاظ میں کہا جائے تو درحقیقت اصول فقہ اصول اجتہاد کا دوسرا نام ہے، مجتہدین یا ان کے تابعین نے اپنے اپنے اصول مدون کئے، اس طرح ہر دائرے کے صول دوسرے دائرے کے اصول سے متضاد یا متعارض ہو گئے ہیں، ایسی صورت میں اصول فقہ ایک ایسا فن ہے، جس میں ابتداء سے ہی ایک قسم کی مدرسیت آگئی، اور مجتہدین کے استخراجی اصول منتسبین کے لئے اصول موضوعہ بن گئے ہیں۔

فقہی اجتہاد کا جنازہ:

پانچویں صدی ہجری میں بعض عارضی عوامل سے متأثر ہو کر ہمارے فقہائے کرام نے فقہی اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے تھے، شاید کہ انہوں نے وقتی مصلحت وتقاضا اور ساتھ ہی ساتھ ماحول کی اصلاح کے پیش نظر یہی کیا ہو، لیکن اس کے منطقی اثرات کی دور رسی اور ہمہ گیری کو محسوس نہیں کیا ہو، کیوں کہ ظاہر ہے کہ دین اسلام کا خارجی پہلو یا اس کے معاشرتی رخ سے اجتہاد کو خارج کر کے جمود کو دعوت دینا گویا ان کی ملی حیات کو جامد بنا دینا تھا، یوں زندگی کے تمام شعبے جامد ہونا شروع ہو گئے، علوم وفنون کی حرکتیں سست ہو گئیں، اگلوں کا ضروری احترام بے جا عصبیت میں تبدیل ہو گیا، یوں اہل علم کی جدت فکر کی بے راہ روی نے نت نئی پگڈنڈیاں نکالیں، متقدمین کے

استنباط کئے ہوئے مسائل چیستان بن گئے، اور اعتراض وجواب، توثیق وتردید اور توجیہ وتاویل کی تہیں جمتی گئیں، اگلوں کی کلیات واستقراء نے پچھلوں کو سرے سے بے نیاز کر دیا، اس تاریک فضاء میں اگر منچلے دماغ نے کوئی چمک محسوس کی تو معاصرین ومتأخرین کی کج بحثیوں نے اس پر دھندلا پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ظاہر ہے کہ زمانے کو قدامت سے بیر ہے، لوگوں نے بہرحال پچھلوں کی پذیرائی کی، اور اگلوں کے کاموں کو کتاب خانے میں بند کر کے طالبانِ علم وفن سے اجتہادی نمونے بھی چھین لئے، نتیجۃً پچھلوں کی جامد تالیفات ان کی رہنمائی کے لئے رہ گئیں۔

اس حوالے سے آپ ہمارے نصاب تعلیم پر نظر ڈال سکتے ہیں، کہ تقریباً ساری کی ساری کتابیں مسلمانوں کے عہد جمود کی یادگار ہیں، بس صرف متن، شروح وحواشی کا ایک چکر ہے، جن میں نہ علوم کی انفرادیت قائم اور نہ مضمون کی جامعیت باقی، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کس کس کا کیا کیا حصہ ہے اور کس کس کی فروگزاشتیں ہیں، اور کس کس کی اصلاحات۔ مزید برآں طرز تعلیم پر نظر ڈالیں گے تو دیکھا جائے گا کہ محض کتابی ہے، نہ زندگی سے مربوط اور نہ مقصد سے چسپاں، یعنی بذاتِ خود قناعتی جمود ہے، اور حقیقتوں سے اغماض اور کج بحثیاں۔

عقائد وکلام:

جہاں تک عقائد کا سوال ہے، دراصل عقائد کی حیثیت دینی اعتبار سے بڑی بنیادی ہے، اس لئے درس میں ایسی کتابیں رکھی جائیں، جن میں عقائد کے متعلق ضروری مسائل ہوں، اور کوئی غیر ضروری اختلافی مباحث کا ذکر تک نہ ہو۔

پھر علم الکلام کی ضرورت بھی ہے، جس کے ذریعے عقائد اسلامیہ کو مخالفین کے اس طرز خیال کے مطابق منوانا، جس کا وہ عادی ہیں، ہمارے نصاب درس میں عقائد وکلام کے حوالے سے جن کتابوں کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے، ان کے ذریعے سے اسلام کی ان حقیقی اور بنیادی معتقدات وخیالات تک پہنچنا (جن پر اسلام موقوف ہے) بہت ہی مشکل اور دشوار ہے۔ ان عقائد اور ان کی تشریحات

اورعقلی توجیہوں کا ڈھانچہ وہ ہے جو اس دور کے مختلف فرقوں کی مذہبی آویزشوں اور مختلف فلسفیانہ خیالات کی ذہنی کشمکشوں کے تحت تیار ہوا ہے، لہٰذا وہ کبھی شاید مفید تھا، مگر اب نہیں۔

ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات کھل کر عیاں ہوجاتی ہے کہ ہمارے عقیدہ وکلام میں مختلف اسباب وعوامل کی بنیاد پر (جن کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں) عجیب وغریب عقائد اور دوراز کار مباحث شامل ہیں، شاید وہ کبھی ضروری بھی تھی، لیکن بات یہ ہے کہ ان کی وجہ سے اسلامی عقائد کی سادگی بالکل غائب ہوگئی ہے، جو ذہن کے لئے سکون وطمانیت کے بجائے مزید درمزید الجھنوں کا باعث بن جاتی ہیں۔

دراصل علم العقائد والکلام ہمارے نصاب تعلیم میں برائے نام ہے، جس میں صرف ایک کتاب ''شرح عقائد نسفی'' ہے، (شائد بعض مدارس کے نصاب میں عقیدۃ الطحاوی بھی ہو) تو جاننے والے جانتے ہیں کہ شرح عقائد نسفی اور عقیدۃ الطحاوی آٹھویں صدی ہجری کی تصانیف ہیں، پھر شرح عقائد کا جہاں تک سوال ہے کہ اس کے ذریعے یونانی فلسفہ کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے، جب کہ جن کی آج ضرورت ہی نہیں رہی، اس لئے علم الکلام کی موجودہ شکل بہت زیادہ قابلِ ترمیم ہے، آج کے دور میں دہریت، سوشلزم، کمیونزم، اور سائنس کے نام سے قرآن کریم پر حملے، حدیث کی صحت وحجیت پر حملے، مذہب کی ضرورت پر پے درپے یورش، اسلام کے عائلی ومعاشرتی اور حدود وقصاص وغیرہ کے احکام پر یلغار، اور تو اور خود ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کئے جارہے ہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ اور ان جیسی واہیات کی تردید سے ہمارا موجودہ علم الکلام سرے سے خالی ہے۔ اس لئے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ علم الکلام کی ایسی کتابیں سامنے لائی جائیں کہ جن سے مذکورہ بالا جیسی واہیات کی تردید ہوسکے، اور اگر ایسی کتابیں نہیں ملتی ہیں تو اس کی تیاری کی طرف توجہ مبذول ہو، میرے خیال میں دور حاضر کی یہ ایک اہم ضرورت ہے، جسے پورا کرنا علمائے اسلام کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔

غرض عقائد کے نام سے ہمارے سامنے ایک ایسا مجموعہ ہے، جس میں دوراز کار بہت ساری

فلسفیانہ مباحث بطور اصول ومبادی کے داخل ہوچکی ہیں، جن کو اصول سمجھ کر بہت سی دوسری غیر اسلامی چیزوں کو بھی ان پر قیاس کیا جاتا ہے، یوں لے دے کر بہت سی لفظی موشگافیوں اور کج بحثیوں کی بھول بھلیاں سامنے آگئی ہیں۔

فن بلاغت:

ہمارے مدارس میں فن بلاغت کے حوالے سے ''تلخیص'' اپنی دوسری شرحوں کے ساتھ زیر درس ہے، لطف کی بات یہ ہے کہ یہ شرحیں بھی ناتمام ہیں، اس لئے یہ کتابیں فن بلاغت کے حوالے سے کسی بھی اعتبار سے مفید نہیں۔

کلمات کی صوتی خصوصیات، ان کے لغوی معانی، اوران کے استعمال کی نوعیت، نیز مقام کے اعتبار سے ان کی قیمت کا جاننا، جملوں کے اصناف اوران کے باہمی ربط کو مقام کے اعتبار سے جاننا اور پہچاننا، مختلف مواقع کے اعتبار سے اسالیب کلام اور طرز ادا کی خصوصیت، اوران اثرات کا علم جن کو وہ پیدا کرتے ہیں، ان کا جاننا فن بلاغت ہے۔

بلاغت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت خود بلغاء کے کلام کو رہی ہے، تقریبا چھٹی یا ساتویں صدی سے حالات کا بدلنا شروع ہوا، اور بجائے بلغاء کے کلام کے بس مستخرجہ اصول نے اہمیت اختیار کرنا شروع کردیا، اور بلغاء کے اسالیب اور جملوں نے شواہد وامثلہ کی حیثیت اختیار کرلی، یوں یہیں سے اس فن میں جمود پیدا ہونا شروع ہوگیا، اور طویل کلام چاہے نثر کا ہو یا نظم کا، اس کے اسالیب پر توجہ کرنا گویا متروک ہوگیا، آخر صرف اور صرف اصول تو رہ گئے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں بھی عقلی موشگافیاں شروع ہوگئیں، اس طرح اس فن نے بھی اپنی حقیقی غرض وغایت سے ہاتھ دھو بیٹھا، آج کی بلاغت تو محض جامد اصول کی تلخیص وتشریح اور دوراز کار بحثوں سے عبارت ہے، لیکن ہمارے مدارس کے ارباب بست وکشاد ان چیزوں پر ڈھٹے ہوئے ہیں۔

سیرت رسولؐ و سیرتِ صحابہ:

ہمارے مدارس میں قرآن و حدیث کے ساتھ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیر صحابہ و تابعین نے اصول کی حیثیت سے اپنی حقیقی اہمیت و مقام حاصل نہیں کر سکا، یعنی ان چیزوں کی اس طرح خدمت نہیں کی جاتی ہے کہ جس طرح کی خدمت کی یہ چیزیں مستحق ہیں، بخلاف اس کے علم العقائد والکلام بشمول منطق و فلسفہ کی طرف زیادہ توجہ دی گئی اور دی جاتی ہے۔

ماضی بعید میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کتابیں شاید کم ملتی ہوں گی، لیکن الحمد للہ آج کل اس موضوع شریف پر بہت ساری کتابیں عربی اور اردو کے علاوہ دنیا کی دیگر علمی زبانوں میں دستیاب ہیں، اس موضوع کے لئے علامہ ابن القیمؒ کی زاد المعاد، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ کی الرحیق المختوم، حضرت مولانا قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی رحمۃ للعالمین، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نبی رحمت، مولانا ابوالکلام آزاد کی رسول رحمت بڑی اچھی کتابیں ہیں۔

عربی زبان و ادب:

ہمارے مدارس میں ایک طرف یوں تو عربی زبان و ادب کی تعلیم کما حقہ نہیں دی جاتی، تو دوسری طرف ان کے نصاب درس میں ادب کے نام سے بہت ساری بے ادبیاں داخل ہو گئیں یا ایک سازش کے تحت داخل کر دی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کی زبان عربی ہے، یہاں عربی زبان و ادب کی جتنی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے زیادہ وقت علوم آلیہ (نحو و صرف) پر صرف کر دیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء نحو و صرف تو کسی طرح جان لیتے ہوں گے، لیکن عربی زبان ادب کے ماہر نہیں ہو پاتے، اس طرح زبان و ادب کے حوالے سے جو مقصد تھا وہ بھی فوت ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان بڑا معنی خیز اور بڑا قابل غور ہے کہ:

’’حضرات مجھے معاف کیا جائے، چودہ پندرہ سال تک لڑکے پڑھتے ہیں، اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے، اگر لکھیں گے تو ایسی عربی ہوگی، جس کو ایک عرب پہچان نہ سکے گا، تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے، جو ہندوستان میں پیدا ہوا، ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کو نئے سرے سے قائم کریں، بہترین کتابیں موجود ہیں، بہترین مواد موجود ہے، ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے، مقامات قطعاً درس میں داخل نہ ہونا چاہئے‘‘ (ملاحظہ ہو: خطبۂ صدارت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ۲۲؍فروری ۱۹۴۷ء لکھنؤ، انڈیا)

منطق و فلسفہ:

مسلمانوں میں یونانی منطق و فلسفہ کا داخلہ دراصل ایک گہری سازش کے تحت اموی دور سے شروع ہوا، اور دور عباسی میں اس کی تکمیل ہوئی، شام کے عیسائی اور صابی اطباء اور نام نہاد متکلمین ان کے داخلے کے ذریعے تھے، جو بالعموم فلسفی ہی نہ تھے، اس لئے ان کے ترجموں میں فلسفیانہ حیثیت سے صحت بہت ہی مستبعد ہے، علاوہ ازیں اکثر ان کے ماخذ بھی ترجمے تھے، یا یونانی خیالات لیکن مخلوط۔ مزید برآں بعض کتابیں بھی غلط مصنفین کی طرف منسوب تھیں، یہ ذخیرہ تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا، جن پر انہوں نے اپنی عمارتیں کھڑی کر دیں، یوں کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی وجہ سے افلاطون اور ارسطو کے سر منڈ گئے۔

بہر حال پھر بھی ابتداء میں یہ فلسفیانہ خیالات ایک حقیقی اور معنوی حیثیت رکھتے تھے، مگر ساتویں اور آٹھویں صدی سے ان کی معنوی حیثیت ختم ہونے لگی، اور لفظی مباحث نے ان کی جگہ لینی شروع کر دی، ابتدائی مسلمان فلسفیوں کے خیالات کو یونانی فلسفیوں کے خیالات کی تشریح کے بطور بے چوں و چرا تسلیم کیا جانے لگا، اور لفظی دقیقہ سنجیوں کا برابر اضافہ ہوتا رہا۔

برصغیر میں مغلیہ دورحکومت میں علوم عقلیہ ایران کے راستے سے داخل ہوئے، جو یہاں والوں کے لئے نئے تھے، ظاہر ہے کہ انسانی طبیعت ہرنئی چیز کو پسند کرتی ہے، یوں یہاں والے پورے انہماک کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ تاریخی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ایرانی مناظرین کی کتابیں ان کی مرعوب کن شخصیات کے ساتھ آئیں، اور مقبول ہوگئیں، لیکن سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ بجائے مختلف نظریوں سے روشناس ہونے کے یہاں والوں کے حصے میں محض لفظی بحثیں، بال سے کھال نکالنے والی سرگرمیاں اور بےمقصد و بےحاصل نکتہ آفرینیاں ہی رہ گئیں، اور تلخیص وتشریح کے ساتھ تحشیہ درتحشیہ کا بگڑا ہوا مذاق پیدا ہوگیا، یوں ان بےحاصل علوم میں ہی سہی اجتہادی وانتقادی کام سے عقلی قوتیں وصلاحیتیں محروم ہوگئیں، اور اس پرمستزاد یہ ہے کہ ان کتابوں کی بنیاد محض قیاسات اور اٹکل پچو کلیات پر تھی، اس لئے یہاں والوں کی تجربی قوتوں کو کسی قسم کی مشق نہ ہوسکی، اور عقلیات میں سے وہ فنون جن کو عملی اغراض سے تعلق تھا، اس میں بھی کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، صرف اور صرف اگلوں کو معصوم اور ہمہ دان مان کر محض ان کے کلام کی تشریح وتوضیح یا توجیہ وتاویل پر اکتفاء کیا گیا۔

یہاں کے مدارس میں منطق وفلسفہ کے نام پر جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں سے بعض اپنے انتہائی اختصار کی وجہ سے بہت ہی دشوار اور بہت ہی کٹھن ہیں، اور طلباء کے ذہنوں کے لئے بار ہوجاتی ہیں، اور ان کی شروح کا جہاں تک سوال ہے، وہ بھی صرف لفظی مباحث اور نکتہ آفرینیوں پر مبنی ہیں، علاوہ ازیں بعد میں ان علوم میں جو اضافے، ترمیمیں اور تنسیخیں ہوچکی ہیں (اصول میں بھی اور فروع میں بھی) وہ محتاج بیان نہیں، لیکن یہاں والے ان سے بھی بےخبر ہیں۔

ملاحظہ ہو کہ علم ہیئت کلی طور پر بدل چکا ہے، علوم طبعیات بدل چکے ہیں، بطور خاص منطق پر شدید سے شدید ترین تنقید ہوچکی ہے، اس میں کافی اضافے ہوئے ہیں، اور فلسفے کے بہت سارے شعبے ہوکر ہر ایک الگ الگ فنون ہوگئے ہیں، حساب میں بہت سے نئے قائدوں کا اضافہ ہوگیا ہے، جن میں بہت سی سہولتیں پیدا ہوگئیں ہیں، لیکن ہمارے مدارس والے افسوس ہے کہ ان تمام جدید

تبدیلیوں سے سراسر بےخبر ہیں، اور ان فنون کو ان کی قدیم اور جامد شکلوں میں لئے بیٹھے ہوئے ہیں، اور سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ ہمارے مدارس کے علمائے کرام علم کے نام پر پائی جانے والی ان قدیم اور فرسودہ چیزوں پر ہر کجا نازان وفرحان نظر آتے ہیں۔

یاد رہے کہ علم ودانش کے نام پر فن منطق جس سرزمین سے نکلا، صدیاں گزر چکی ہیں کہ وہاں کے عقلاء وفضلاء اور ارباب علم ودانش نے اسے ایک لایعنی، بےکار اور فرسودہ چیز جان کر ردی کی ٹھوکری کا حصہ بنا دیا تھا، لیکن بدقسمتی سے ہمارے بعض مسلمان علماء اور دانشوروں نے اسے یونان وروم وغیرہ علاقوں سے برآمد کرکے بڑی دیدہ دلیری سے علوم اسلامیہ کا حصہ بنا دیا تھا، اس نام نہاد فن کی وجہ سے اسلام اور امت مسلمہ کا کتنا بڑا نقصان ہوا، اس کی ایک الگ داستان ہے، تاہم اس کی داستان سرائی سے صرف نظر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف سازش کرنے والوں نے دانستہ طور پر نہایت زیرکی اور بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ اسے بعض عظمائے اسلام سے متعارف کرایا، یوں ہمارے ان بزرگوں نے شاید نادانستہ طور پر ہو کہ اسے ایک مقدس اور پاکیزہ علم سمجھ کر نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ بعض مسلم حکمرانوں نے اسے سرکاری سرپرستی میں عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔

بہرحال فن منطق کو ہمارے مدرسوں کے نصاب تعلیم میں آج تک باقی رکھنے کا شاید مقصد یہ ہو کہ متأخرین علماء وفقہاء تو کیا بلکہ بعض مفسرین کی اکثر کتابیں اور چھٹی صدی کے بعد کے علماء اسلام کے بعض علمی ذخیرے جو منطقی اصطلاحات اور فلسفیانہ لب ولہجے میں پیش کئے گئے ہیں، اگر طلبائے مدارس ان مصطلحات کو جان نہیں لیں گے تو انہیں ان علمی ذخیروں سے مستفید ہونے میں بڑی دقت ہوگی۔ لیکن اس حوالے سے یہ بات اچھی طرح یاد رہے کہ درحقیقت علوم قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی گہرائیوں تک رسائی کے لئے منطق وفلسفہ کی قطعا ضرورت نہیں ہے، بلکہ ماہرین علوم اسلامیہ کے مطابق یہ علوم دینیہ کے لئے مفید ہونے کے بجائے نہایت مضر ہے، اس حوالے سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ:

’’اب وقت آ گیا ہے کہ جہاں تک معقولات کا تعلق ہے کہ آپ اس پر غور کریں، کہ معقولات کا جو ذخیرہ ہے، وہ سب بے کار ہے، سوائے اس کے کہ دماغ کو اس سے بے کار کریں، اور کوئی نتیجہ نہیں‘‘۔

مولانا آزاد پھر دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

’’نتیجہ یہ تھا کہ ان مدرسوں سے جو لوگ پیدا ہوئے، زمانہ ان کا استقبال کرتا تھا، بہر طور وہ زمانہ گزر گیا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ کہ زمانہ تو اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا، اور آپ وہیں بیٹھے رہے، آپ انہی مدرسوں میں بیٹھے رہے جن میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا، اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی، زمانہ بھی چلتا رہا، وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کر چکا ہے، اور آپ وہیں بیٹھے ہوئے ہیں، آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں، آپ وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ نہیں جوڑ سکتے، نتیجہ یہ ہے کہ زمانے میں اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہو گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم کہ جس تعلیم سے ملک کے بہترین مدبر، ملک کے بہترین منتظم، اور ملک کے بہترین عہدیدار پیدا ہوتے تھے، آج انہی مدرسوں کو یہی سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ بالکل نکمے ہیں، ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد مسجدوں میں بیٹھ کر بس یہ لوگ خیرات کی روٹیاں توڑ لیں، کتنی افسوس کی بات ہے‘‘۔ (ملاحظہ ہو: خطبۂ صدارت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ۲۲ر فروری ۱۹۴۷ء لکھنؤ، انڈیا)

فلسفہ و منطق پر تنقیدی نگاہ ڈالنے والے دنیائے اسلام بشمول برصغیر ہندوستان کے بڑے بڑے علماء، عظماء اور دانشوران ہیں، ان میں سے ایک مشہور دانشور، نامور مورخ اور معروف قلم کار شیخ محمد اکرام صاحب مرحوم کی یہ تحریر ملاحظہ ہو کہ:

’’اب رہی علوم عصریہ! تو کوئی بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عصر کے بدل جانے کے ساتھ اب مدارس اسلامیہ کے علوم عصریہ بھی بے وقعت ہو گئے ہیں، جو چیزیں فلسفۂ قدیم کی مسلمات سمجھی جاتی رہی ہیں، اب وہ بدیہی البطلان بن گئی ہیں، اب ان کا پڑھنا صرف ایک خاص زمانہ کی عقلی رفتار کے جان لینے کی حیثیت سے تو مفید ہو سکتا ہے، ورنہ علمی اعتبار سے ان کا کوئی وزن نہیں، مدارس میں بالعموم رسالہ ملا جلال و میر زاہد کی صرف ایک یہ بحث کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ پورے ایک برس میں تمام ہوتی ہے، اور پھر بھی دماغ میں روشنی پیدا نہیں ہوتی‘‘۔ (ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، دینی مدارس، ص: ۶۴۳)۔

ہمارے نصاب میں فن نحو:

عظیم و نامور عالم، فلسفی مورخ علامہ ابن خلدونؒ کے مطابق کسی علم میں مہارت حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس علم کے مبادی، قواعد و مسائل پر حاوی ہونے کی قدرت اور اس کے اصول سے فروع کو استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہو، جب تک یہ قدرت اور یہ ملکہ پیدا نہ ہو، اس علم کی مہارت پیدا نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں میں جب استنباط و استخراج کا دور ختم ہو گیا، تو نحو کی تدوین بھی خالص مدرسی حیثیت میں شروع ہو گئی، اس کے بعد تہذیب کا دور آیا، اور آٹھویں نویں صدی سے نحو کا نام ہو گیا۔

پھر استخراجی اصولوں کی بھی محض عقلی بنیادوں پر توجیہ کرنے کی کوشش شروع ہو گئی، مگر یہ بھی آگے چل کر انتہائی مضحکہ خیز ہو گئی، اور فنی حیثیت اختیار کرنے لگی، یوں نحو کی مہارت بھی ایک طرح کے مضحکہ خیز موشگافیوں کے جاننے کا نام ہو گیا، جن کو نہ فن سے تعلق تھا، اور نہ اس کی غرض و غایت سے رشتہ۔

ویسے ہمارے مدارس کے نصابِ درس کو مذکورہ بالا نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو جائے

گا کہ نہ صرف یہ نصاب علمی مہارت پیدا کرنے سے قاصر ہے بلکہ علم کے صحیح مذاق سے آشنا بنانے کے لئے بھی سراسر ناکافی ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے نصاب درس میں ابن حاجب کی ''کافیہ'' نامی کتاب جو بڑے ذوق و شوق سے پڑھائی جاتی ہے، اس ہماری مقدس کتاب کے حوالے سے بات یہ ہے کہ اولا یہ کتاب فن نحو کے تمام مسائل پر حاوی ہی نہیں، دوسرے یہ کہ یہ کتاب اپنے اختصار کی وجہ سے اتنی ہی مشکل ہے کہ طالب کے دماغ پر محض مطلب سمجھنے میں غیر معمولی بار پڑتا ہے، یوں اکثر طلبائے مدارس اس کے نہ سمجھنے کو اپنی کند ذہنی کا نتیجہ خیال کرنے لگتے ہیں، ویسے پڑھائی کے حوالے سے ان کی حوصلہ افزائی ہونے کے بجائے حوصلہ شکنی ہو جاتی ہے۔

پھر شروح کی تصنیف کا مقصد ہی چوں کہ مسائل کا بیان کرنا نہیں ہوتا، لہذا ہمارے مدارس میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھی پڑھائی جانے والی اور ایک کتاب ''شرح ملا جامی'' اس اعتبار سے مفید ہی نہیں کہ وہ نحو پر حاوی ہے، مزید برآں وہ اس اعتبار سے بھی مفید نہیں ہے کہ اس سے نحوی مسائل کی تحقیق اور اخذ واستنباط میں کوئی بھی مدد ملتی ہو، اس لئے یہ کتاب نحو کی غرض وغایت اور اس کے علم آلی ہونے کے اعتبار سے فائدہ بخش اور نہ فن نحو کی اصولی اور ذوقی حیثیت سے نفع رساں، اس میں بجائے اس کے کہ مسائل نحویہ کے دلائل کو اہل زبان کی بول چال سے اخذ کرنے کی اہمیت پر زور دیا جائے اور ساتھ ساتھ ان کی صحت اور ترجیح کے لئے اہل زبان کی سماع کو فیصلہ کن قرار دیا جائے، بس اس میں عقلی توجیہیں اور مضحکہ خیز موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اس سے طلباء میں فن نحو کا صحیح مذاق پیدا ہونے کے بجائے ایک قسم کا غیر فنی مذاق پیدا ہو جاتا ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ نحو کے متعلق کتابوں جیسی ''کافیہ'' اور ''شرح ملا جامی'' کے بجائے فن نحو کی ایسی کتابیں داخل نصاب کی جائیں، جن سے طلباء اس فن سے بخوبی آگاہ ہو سکیں، اور وہ محض کج بحثیوں میں الجھ کر پریشان نہ ہو جائیں۔ اس حوالے سے یاد رہے کہ آج کل دنیا میں اس فن کی بہت سی بہترین کتابیں ملتی ہیں، جن سے ہم مستفید ہو سکتے ہیں۔

یک رخا پن کی ایک وجہ:

تاریخ شاہد ہے کہ سرزمین ارکان بنگلا دیش کی پڑوسی اکثر علاقہ جات میں دین اسلام کی نشر و اشاعت میں ایک خاص مکتب فقہ سے متأثر صوفیائے کرام کا دخل ہے۔ اللہ تعالی ان کے مراتب بلند فرمائے۔ ان فقہاء نما صوفیاء کا مقدس طبقہ اپنی صلح کل اور انسانوں کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی حکمتِ عملی میں قائم اور سرگرم رہنے کے ساتھ ہی ساتھ متصوفانہ خیلات وتاویلات میں بھی سب سے آگے رہا ہے۔ بعض اسباب ووجوہات جن کی داستان بڑی طولانی ہے کی وجہ سے ان صوفیائے کرام کی یہ عام ذہنیت منفی طور پر ایک حد تک اس بات کا سبب بن گئی کہ اسلامی عقائد واعمال غیر اسلامی اوہام ومراسم سے کبھی بھی صاف نہ ہو سکے، اور کسی قدر علم وفن سے آشنا لوگوں میں بھی تنقید و اجتہاد کی طرف کوئی میلان پیدا نہ ہو سکا، اس پر مستزاد یہ ہے کہ اسلام کے اصل اصول یعنی قرآن و حدیث نیز اس کے مقدس شارحین صحابہ اور تابعین کے اقوال واعمال کی طرف خاطر خواہ توجہ مبذول نہیں ہو سکی، ان صوفیائے کرام کے متصوفانہ خیالات کا اثر عمومی طور پر معاشرہ میں پڑا تو پڑا، خصوصی طور پر ان کے اثرات سے ہمارے وہ علمائے کرام جو خالص اسلامی علوم وفنون کے میزان میں صوفیاء کی ان مذکورہ چیزوں کو جانچنے کے قابل تھے، وہ بھی نہ بچ سکے، اور ان فقہاء نما صوفیاء کے زیر اثر یہاں جو ذہنی فضاء تیار ہو چکی تھی، اس کے ملبے تلے ہمارے مدارس اور علمائے کرام کسی قدر پر دب چکے تھے، اور یہ حالات جوں کا توں اب بھی باقی ہیں، چناں چہ ان حالات کا منطقی انجام یہ نکلا کہ ہمارے مدارس اسلامیہ کے طریقۂ درس یا طرز تعلیم میں اہل سنت والجماعت کے مذاہب اربع میں سے صرف حنفی اصول وفروع رہ گئے ہیں، اور اہل سنت والجماعت کے مسلمہ دوسرے مکاتب فقہ کے اصول وفروع سے یہاں صرف اتنا تعلق رہا کہ ان کی تردید کے لئے بس احناف کی کتابوں میں جستہ جستہ ان کا تذکرہ آتا ہے، تو ایسے حالات میں ہمارے طلباء کی نظر یک رخا ہونا ناگزیر امر تھا اور ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور مدارس دینیہ کے سرپرستوں کو اس اہم نکتہ کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

جدید نصابِ تعلیم پر غور:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے مدارس اسلامیہ میں دینیات کے جدید نصابِ تعلیم کے لئے غور وفکر کرتے وقت اس بات کے خیال رکھنے کی شدید ضرورت ہے کہ آیا ہمارے نصاب تعلیم اسلامی رجحانات سے پوری طرح مناسبت رکھنے کے علی الرغم عصر حاضر کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں؟۔

اگر چہ فلسفہ ومنطق نام کے علوم کی جگہ علوم جدیدۂ عصریہ کا بخوبی اضافہ ہمارے نصاب میں ہونا ایک لازمی امر ہے، تاہم ایک بات اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اسلامی مدارس کا بنیادی مقصد انجینئر، ڈاکٹر، سائنس دان، قانون دان یا ماہر تجارت ومعیشت پیدا کرنا نہیں، اس لئے علوم جدیدۂ عصریہ میں سے وہی مضامین داخل نصاب ہو، جو یونیور

ہمارے مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں پہلی بات یہ تحقیق کرنی ہوگی کہ آیا ہمارے نصابِ درس میں وہ خاص حصہ کون سا ہے، جو لازم کی حیثیت رکھتا ہے، اور کون سا ایسا حصہ ہے جو اختیاری ہے۔ زیرکی کے ساتھ ان امور کی صحیح تحلیل کر لی جائے تو ممکن ہے کہ جلد از جلد اس کی اصلاح کے لئے صحیح راسیٹیوں میں فکلٹی آف آرٹ اور سوشل سائنس کے تحت آتے ہیں، مثلا اقتصادیات، فلسفۂ جدیدہ، سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات اور شہریت، ان کے علاوہ طلباء کو جنرل سائنس اور بلدیات سے بھی واقف کرانا ضروری ہے۔ مذکورہ علوم کے علاوہ طلباء کو انگریزی اور ملکی زبان کی تعلیم دلانے کی طرف توجہ دینی چاہئے، اور یاد رہے کہ طلباء کے لئے ان باتوں کا جاننا نہایت ضروری ہے کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا ہیں اور دنیا کی ہوا کا رخ کس سمت جا رہا ہے؟

ہر باشعور انسان اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ آج دنیا کی زبان بدل چکی ہے، مفروضات اور مسلمات تبدیل ہو چکے ہیں، اس کے تصورات میں زمین وآسمان کا فرق آچکا ہے، طرز فکر بالکل دوسرا ہو گیا ہے، اس کے مسائل دوسرے ہو گئے ہیں، اس کی طاقتوں میں نوعی فرق آ گیا ہے، اس نے پرانے تمام اسلحے بدال ڈالے اور جدید اسلحہ جات سے پوری طرح لیس ہو چکی ہے، اس کا

مزاج وطبیعت کلی طور پر بدل گئی ہے۔ لہذا آج اگر ہم کو اس کے سامنے اسلام کی ابدی اور لازوال حقیقت وصداقت کا پیغام پہنچانا ہے تو ہمیں پہلے سے مختلف زبان استعمال کرنی پڑے گی، اس کے تفکر کے مطابق نت نئے طریقوں اور حکمتِ عملیوں سے اسلام کو نئے زاویے سے مطالعہ کر کے اس کے سامنے پیش کرنا ہوگا، اس سے ضرورت کی بنیاد پر نبرد آزمائی کے لئے نئی طاقتیں وقوتیں حاصل کرنی ہوں گی، بلکہ شک نہیں ہے کہ نئی اسلحہ بندی کرنی پڑے گی، اس کو متأثر کرنے کے لئے نت نئے مؤثرات استعمال کرنے ہوں گے، غرض اس مادی دنیا کے سامنے اسلام کی روحانیت کو اس کی مادی سڑک سے لے جانا پڑے گا، اس کے لئے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ تیاری کرنی پڑے گی، بڑی ہشیاری اور دانشمندی کے ساتھ پروگرام اور حکمت عملیاں ترتیب دینی پڑیں گی، ویسے ظاہر ہے کہ ہمارے ایسے حالات میں ان سب کی تیاریاں بجز ہماری تعلیم گاہوں اور تجربہ گاہوں کے اور کہاں ہوسکتی ہیں؟۔ ستے مل جائیں گے۔

پھر دینی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کرنی ہے تو اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے، جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا، ہمارے مدرسوں کو عصر حاضر کی مثبت اور کارآمد روح جذب کرنی ہوگی، قدیم اور فرسودہ علوم وفنون کے بجائے علوم وفنون کو ان کی ترقی یافتہ شکل وصورت میں نصاب درس میں شامل کرنا ہوگا، اور تعلیم کو زندگی سے مربوط کر کے ہمیں آگے بڑھنا ہوگا، ہمارے ان درس گاہوں کا دینی پہلو یہ ہونا چاہئے کہ طلباء کو اسلام کی حرکی قوتوں سے آشنائی ملے۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے زندگی کو کس طرح ضبط کیا جا سکتا ہے، یہ درس گاہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیات پیدا کریں گی۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم، مواد، موضوع اور طریق تدریس کے تعلق سے ایک انقلابی اور عہد آفرین تبدیلیوں کا طالب ہے، ان کی ضروریات سے اگر آنکھیں موند لی گئیں تو ٹوٹے میں نہ مسلمانوں کی دینی تعلیم رہے گی اور نہ زندہ روی کے ساتھ ان کی دینی درس گاہیں، بلکہ عام مسلمانوں کا فہم دین بھی بری طرح مجروح ہو جائے گا، اور معاشرہ میں دین کے متعلق بڑے پیمانے پر ہر طرف

سے جو الزامات لگائے جارہے ہیں، غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلائی جارہی ہیں، ان کی موج وطلاطم اور سیلاب وگرداب کے آگے ہمارے مدارس دینیہ اور علماء اسلام مزید پسپا ہوتے چلے جائیں گے، تو ظاہر ہے کہ اس سے نفع کس کا ہوگا اور نقصان کس کا؟

مذکورہ ان امور کے حوالے سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

> ”کسی ادارے یا کسی زندہ جماعت کے لئے اپنی عمر میں صرف ایک بار حقیقت پسندی سے کام لینا، مادی نظام کے اندر ضروری تبدیلی پیدا کرنا اور اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا کر نئی کوشش کرنا کافی نہیں۔۔۔۔کسی ادارے کی افادیت، عملی زندگی میں اس کا مقام اور وہ رول جو وہ ادا کرتا ہے تنہا اس کی حیات کا ضامن ہے۔ تعلیم کی موجودہ تنویت اور اس کی دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی بدعت ہے، پہلے ہمارا نظام تعلیم وحدانی اور سالمیت پر مبنی تھا، ہمارا قدیم نصابِ تعلیم جس کی درس نظامیہ نمائندگی کرتا ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم اور ثقافت، ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا، یہ جہاں محدث، فقیہ اور مدرس تیار کرتا تھا، وہاں سول سروس کے عہدیدار اور ارکان سلطنت بھی مہیا کرتا تھا، اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محبّ اللہ بہاری اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی تھے، اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے، یہی حال دوسرے ملکوں میں بھی تھا، کہ دینی و دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نصاب اور نظام نہیں تھے، چناں چہ سب کو علم ہے کہ مشہور ریاضی دان شاعر عمر خیام اور سلطنت سلجوقیہ کا وزیر با تدبیر نظام الملک طوسی دونوں ایک ہی حلقۂ درس کے شریک اور ایک ہی تعلیم کے پیداوار تھے“۔ (ملاحظہ ہو، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ندوۃ العلماء کا کتابچہ)۔

ہماری تعلیم کی بعض خامیاں اور تجاویز:

نصاب تعلیم کے ساتھ ہمارے مدارس کا نظام اور طریقۂ تعلیم بھی بڑی اصلاح طلب ہے، اگر چہ درج ذیل چیزیں اس کی ساری خامیوں کی نشان دہی پر مشتمل نہیں ہیں، لیکن اس حوالے سے کچھ خامیوں کی نشان دہی کے ساتھ کچھ تجاویز اور سفارشات پر مشتمل ضرور ہیں۔

۱۔ مدارس اسلامیہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر خصوصی توجہ رہی تھی، لہذا تعلیم کے ساتھ تربیت پر زور دیا جائے، تاکہ تعلیم برائے تعلیم کے بجائے تعلیم برائے زندگی ہو، ایک قاری اور ایک راوی ہونے کے ساتھ عامل (یعنی عالم باعمل) محقق، مدقق، مفکر، مدبر اور مصلح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، علم کو تربیت اور استعمال کے ذریعے اسے زندگی کا ایک حصہ بنا دیا جائے، لہذا علم کے ساتھ اساتذۂ کرام طلباء کی سیرت وکردار کو نکھارنے سنوارنے کی کوشش کریں، تاکہ مدارس سے نکلنے والے طلباء اسلامی اخلاق وکردار کے حسین وجمیل پیکر ہوں، اور اپنی سیرت وکردار سے اصلاح معاشرہ اور دعوت اسلامی کی خدمات حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

۲۔ ہمارے مدارس کے نظام تعلیم کی ایک خامی یہ ہے کہ یہاں ہر طالب علم کو ”مجموعۂ علوم“ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ کسی فن کا بھی ماہر نہیں ہوسکتا۔ الا ماشاء اللہ۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی شخص کے لئے جملہ علوم وفنون کی مہارت حاصل کرلینا دشوار ہے، شاید ممکن بھی ہو، لہذا ہمارے مدارس میں اختصاصی تعلیم کا طریقہ اپنانا چاہئے۔

۳۔ ہمارے نظام تعلیم کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ یہاں طلباء کی غیر درسی مصروفیات کا کوئی مربوط ومستحکم نظم نہیں ہوتا ہے، جس کی وجہ سے طلباء کی مختلف صلاحیتیں اجاگر نہیں ہو پاتیں، لہذا مدارس کے نظام کے حوالے سے اس اہم اور ضروری نکتے پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۴۔ ہمارے مدارس کی اور ایک بڑی خامی کتابی طریقۂ تعلیم کا رواج ہے، اس حوالے سے سفارش ہے کہ بطور خاص اعلی وتخصصی درجات میں املاء اور لیکچرز کا طریقہ رائج کیا جائے، اور تجربہ کاروں

کے تجربے سے ثابت ہے کہ یہ طریقہ طلباء کے لئے بہت ہی مفید ہے۔

۵۔ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی تعلیم آزادانہ غور وفکر سے ہو، تاکہ طلباء میں کسی طرح کی کوئی عصبیت پیدا نہ ہو، اور یادرہے کہ ان اساسی علوم کی تدریس کے دوران مسائل حاضرہ پر انطباق بھی ہوتا رہے۔

۶۔ ہمارے رائج الوقت نصاب تعلیم میں علوم آلیہ کا بڑا غلبہ ہے، ظاہر ہے کہ اسلامیات اور عربی علوم کی حیثیت سے جو چیزیں ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں کچھ تو مقصود بالذات ہیں (مثلاً تفسیر قرآن، حدیث نبوی اور فقہ اسلامی) اور کچھ چیزیں بس وسائل وذرائع ہیں (مثلاً نحو وصرف اور بلاغت وغیرہ) تو نصاب میں غالب حصہ انہی علوم کا ہونا ضروری ہے جو مقصود اصلی ہیں۔

۷۔ معقولات کی قدیم کتابوں اور قدیم علم الکلام کو بس اسی حد تک نصاب میں شامل رکھا جائے جس سے مصطلحات کی ضروری واقفیت ہو، تاکہ طلباء قدماء کی کتابوں سے مستفید ہوسکیں۔

۸۔ ہمارے فقہ کے نصاب میں اصول کا حصہ کم اور فروع کا زیادہ ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب میں اصول کے حصہ کو زیادہ شامل کیا جائے، تاکہ طلباء کے اندر کتاب وسنت سے مسائل کے استنباط واستخراج کی اہلیت پیدا ہو۔

۹۔ ہمارے نصاب درس میں تاریخ کا عنصر کم بلکہ نہ ہونے کا برابر ہے، لہذا نصاب میں فن تاریخ کی شمولیت انتہائی ضروری ہے، اس حوالے سے یادرہے کہ آج کل فن تاریخ نے غیر معمولی اہمیت حاصل کرلی ہے۔

۱۰۔ رائج الوقت نصاب میں عربی زبان وادب اور انشاء کی اہمیت بہت ہی کم ہے، ساتھ ساتھ اس کے طریقۂ تعلیم میں بھی کافی خامیاں پائی جاتی ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اور تو اور مقامات حریری اور مقامات بدیع الزمان ہمدانی جیسی کتابوں کے بجائے منتخب ادبی کتابیں شامل نصاب کی جائیں، ساتھ ساتھ ادب عربی کی جدت طرازی اور انشاء پردازی پر بڑی اہمیت کے ساتھ زور دیا جائے۔

۱۱۔ اسلام دین ودنیا میں تفریق کا قائل نہیں ہے، اس لئے علوم عصریہ سے چشم پوشی اور بے اعتنائی سرے سے مناسب نہیں ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے انسان اور انسانیت کی خدمات کے لئے تمام مثبت علوم مفید، مطلوب اور مستحسن ہیں، جن کے بغیر طلباء عصر حاضر کے تقاضوں سے عہد برآ ہوسکتے اور نہ وقت کی نزاکت سے واقف ہوسکتے ہیں، لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ میں ضروری سائنس، ٹکنالوجی کے ساتھ ریاضی، سماجیات، معاشیات، اقتصادیات، اور سیاسیات وغیرہ علوم شامل نصاب کئے جائیں۔

۱۲۔ مدارس اسلامیہ کے طلباء کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ وہ مختلف مذاہب وادیان کے متعلق ضروری واقفیت رکھتے ہوں، افسوس ہے کہ مدارس کے فارغین خود اپنے اردگرد اور اپنے علاقہ اور ملک میں پائے جانے والے مختلف مذاہب (جیسے ہمارے علاقے کے بودھ مت اور ہندومت وغیرہ) کے بارے میں اصولی طور پر معلومات نہیں رکھتے، لہذا ہمارے مدارس میں مذاہب وادیان کے حوالے سے تقابلی مطالعہ ضرور شامل نصاب کیا جائے۔

۱۳۔ سفارش ہے کہ ہمارے مدارس میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم مادری زبان میں ہو، تاکہ بیک وقت طلباء پر کئی بوجھ نہ پڑیں۔

۱۴۔ عربی زبان کے صرف ان ہی حصوں کو مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھا جائے، جن میں ان کی دینی معلومات ہیں، تاہم عربی کے دوسرے طول طویل حصوں کو اعلی تعلیم میں بطور اختیاری مضامین رکھا جاسکتا ہے، بلکہ اختصاصی علماء بھی اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کئے جائیں تو ایک دوسری ضرورت ہے، لیکن خاص پڑھے لکھے مسلمانوں کو جس عربی کی حاجت ہے، وہ صرف اسلامی ادبیات والی عربی ہے۔

۱۵۔ عربی کو قصے کہانیوں کی کتابوں کے ذریعے سکھانے کے بجائے خود قرآنی پاروں اور حدیثی و فقہی متون کے ذریعے سکھانا زیادہ مفید ہے، اور ضروری بھی۔

۱۶۔ اسلامی ادبیات والی عربی کے لئے صرفی ونحوی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں کی قطعا

ضرورت نہیں، جوکسی زمانے میں دماغی تمرین کے لئے پڑھائے جاتے تھے۔

۱۷۔ درس نظامی میں صرف کی بہت زیادہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مثلا میزان منشعب، پنج گنج، علم الصیغہ، اورفصول اکبری وغیرہ، اوریہی حال نحو کا بھی ہے۔عربی ممالک میں صرف کا جونصاب ہے، ہمارے یہاں اسے رائج کیا جائے، ساتھ ہی ساتھ تمرینات پر زیادہ زور دیا جائے۔

۱۸۔ انگریزی زبان ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے، لہذا مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان کولازما شامل کیا جائے، تاکہ یہاں سے فارغین موجودہ افکاروخیالات سے واقف ہوکراسے اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے استعمال کرسکیں۔

۱۹۔ **وما ارسلنامن رسول الا بلسان قومه** کے پیش نظر ملکی اورقومی زبان کی بڑی خصوصیت ہے، اوراہمیت بھی، لہذا مدارس کے نصاب میں اسے لازما شامل کیا جائے۔

۲۰۔ اسلامی مدارس کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ صنعت وحرفت کی تعلیم کا نظام بھی ہمارے مدارس میں رہا ہے، تو ہمارے مدارس کی تعلیم میں اس کا بھی بندوبست کیا جائے، تاکہ فارغین اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر زندگی بسر کرسکیں، اوردنیا میں عزت ووقار کے ساتھ رہتے ہوئے معاشرہ میں اصلاح، دعوت اورخدمت دین کا کام بخوبی انجام دے سکیں۔

۲۱۔ ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں وہی چیزیں پڑھائی جائیں، جواستادوں سے پڑھے بغیر سیکھی نہیں جاسکتیں۔

۲۲۔ یہاں ایک بڑی کمی یہ بھی ہے کہ عام طور پرلڑکیوں کی اعلی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے، حالاں کہ خواتین ہمارے معاشرہ کا نصف حصہ ہیں، لہذا خواتین کوعلم کے زیور سے آراستہ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔تاکہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ بھی معاشرہ میں رول ادا کرسکیں۔

۲۳۔ آخر میں عرض ہے کہ آج مدارس اسلامیہ کے سرپرستوں اورعلمائے کرام واساتذۂ مدارس اسلامیہ کا اولین فرض ہے کہ وہ نصاب درس اورنظام تعلیم کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کریں، اورعلوم اسلامیہ کی تعلیم میں ترتیب کی خاص رعایت رکھا کریں، بطورخاص علوم دینیہ کی تعلیم پر

ادبیات (جوان علوم کے لئے لازمی اورضروری ہیں) کی تعلیم کومقدم کریں (یعنی اصل زبان کی نحوو صرف اور بلاغت کی تعلیم) اورکتاب وسنت کی تعلیم کوعلوم فقہیہ اورعلوم عقلیہ وکلامیہ (منطق وفلسفہ) پر مقدم کیا جائے، چوں کہ اسلامی فقہ وعقائد اور تمام شرعی علوم کا سرچشمہ قرآن وسنت ہے، لہذا فقہیات وعقائد کے مطولات ایسے طلباء کو پڑھانا جوقرآن کریم کا ترجمہ ومعانی کامل طور پر جانتے ہیں اورنہ کتب حدیث پران کی نظر ہے، کلی طور پرایک فضول کوشش ہے، اورطلباء کی عمر برباد کرنے کے سوااس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں۔ پھر ہمارے مدارس کے طلباء کسی کتاب کوبھی بغیر کسی شروح وحواشی کی مدد سے بالکل سمجھ نہیں سکتے، یادرہے کہ طالب علم اپنے اسباق کے سمجھنے میں شروح وحواشی کامحتاج ہونا، اوراپنے وقت کا ایک معتدبہ بلکہ بڑا حصہ لمبے چوڑے حواشی اوردورازکارشروح میں صرف کردینا بلاشبہ فساد نظام تعلیم کا نتیجہ ہے، اوراگرتعلیم کے وقت علوم کی ترتیب کوپیش نظر رکھا جائے، تواس قسم کی خرابیوں کے واقع ہونے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہے گا۔

حرفِ آخر:

کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام ایک لازوال اورابدی دین ہے، اورامتِ مسلمہ بھی ایک لازوال اورسارے جہاں کے لئے رہنماء امت ہے، تو وجہ یہی ہے کہ باطل قوتیں اورطواغیت و شیاطین ہردوراور ہرزمانے میں بھیس بدل بدل کراسلام اورامتِ مسلمہ کے خلاف سازشیں اور پروپیگنڈے کرتے رہے ہیں، اس لئے مسلمانوں کے اہل فکرونظراورعلم ودانش کوہمیشہ ان کی سازشی سرگرمیوں سے مطلع اورباخبر رہنا ضروری ہے۔

اہل علم ونظر بخوبی واقف ہے کہ عباسی دورحکومت میں علوم شرعیہ پرعقلی علوم کے نام سے بے عقلوں کے شدید سے شدیدترین حملے ہوئے، جن کی وجہ سے مسلمانوں کا علمی وفکری شیرازہ بکھرکررہ گیا تھا، مامون الرشید نے کتب فلاسفہ کے ذخائر یونان سے بغداد منگواکرسرکاری سرپرستی میں ان کی بھرپوراشاعت کی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اہل علم کا ایک بڑااورمعتدبہ طبقہ فلسفۂ یونانی سے

متأثر ہوکر گم راہ ہوگیا، اور مسلمانوں میں سے معتزلہ جیسا گروہ پیدا ہوگیا۔ تاہم مسلمانوں کے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ ان میں سے بروقت امام احمد بن حنبلؒ، امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابو المنصور ماتریدیؒ اور حجۃ الاسلام امام غزالیؒ جیسے آسمان علم وعمل اور فکر وآگہی کے چند چاند وتارے پیدا ہوگئے، جنہوں نے اسلام کے خلاف کی گئی تمام سازشوں اور فتنوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا، اور ان سازش کاروں، فتنے پردازوں اور نام نہاد عقلیت پرستوں کو میدن سے پسپا کر دیا تھا۔

اگرچہ اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف سازش کاران پسپا ہوگئے، لیکن وہ کبھی بیٹھے ہوئے بھی نہ تھے، کہ آئے دن چہرے بدل بدل کر اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف مختلف طریقۂ کار اور حکمت عملیوں کے ساتھ سازشیں کرتے رہے تھے، جس کا سلسلہ مختلف شکلوں میں تاحال جاری ہے۔

دراصل مسلمانوں کے مابین اور تو اور مسلکی، مشربی اور فکری اختلافات کے جنم داتے انسان وانسانیت کی خیرخواہی کی شکل میں انسان اور انسانیت دشمن یہود تھے، اور بدقسمتی سے اختلافات نے کافر سازی کی جس رسم کو ہمارے مسلم معاشرے میں گہرا کر دیا تھا، اس کا آغاز بھی انہی سازش کاروں کی سازشوں سے ہوا تھا۔

پھر آج کل کے حوالے سے بھی ہمیں ہشیار رہنا چاہئے، کہ عصر حاضر میں استعماری قوتوں نے اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف جدید ترین شکل میں جدید ترین اسلحہ جات سے لیس ہوکر سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے، اور اچھی طرح یاد رہے کہ دراصل ان کے پیچھے بھی درپردہ انسان اور انسانیت کے دشمن یہودیوں کا ہاتھ ہے اور ہاتھ ہوتا ہے۔

اس حوالے سے ہمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی تعلیمی درس گاہیں اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہین طلباء ان اوباشوں کا اصل ہدف ہے، اسلام کے خلاف باطل نظریات کے فروغ میں ظاہر ہے کہ نصاب اور نظام تعلیم کا بنیادی کردار ہوتا ہے، ہمارے برعکس جس سے وہ سازش کار بخوبی واقف اور آگاہ ہیں۔ تو انہوں نے ایک گہری سازش کے تحت نئے نظام تعلیم کے نام سے اور تو اور عالم اسلام کی مسلم درس گاہوں میں درج ذیل اہم

تبدیلیاں سامنے لائیں:

۱۔ درس وتدریس کی زبان کی تبدیلی۔
۲۔ اسلامی رسم الخط کی تبدیلی، اس حوالے سے ترکی کی زبان ہمارے سامنے ہے۔
۳۔ درس میں غیر ملکی زبانوں کو اسلامی زبان کے بجائے لازمی قرار دینا۔
۴۔ دینی اقدار کے احترام کو کلی طور پر ختم کردینا۔
۵۔ نصاب درس میں لادینیت پر مبنی مواد کی شمولیت۔
۶۔ دنیا بھر میں عموماً اور اسلامی معاشرہ میں خصوصاً علمائے اسلام اور طلبائے دین کی تحقیر۔
۷۔ مدارس اسلامیہ کے لئے لادینی افکار ونظریات کے حامل اساتذہ کا چناؤ۔
۸۔ مسلمان طلباء کے مابین مخلوط تعلیم کا انتظام۔
۹۔ دینی مدارس کے گرد گھیرا تنگ کرنا۔
۱۰۔ دینی مدارس اور عصری تعلیم گاہوں اور اداروں کے مابین خلیج پیدا کرنا۔

علاوہ ازیں سازش کاروں نے عمومی طور پر نصاب تعلیم میں درج ذیل خصوصیات پیدا کردی ہیں:

۱۔ مغربی اقدار کا فروغ۔
۲۔ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ذہن سازی۔
۳۔ اصلی اور صحیح تاریخ سے جاہل رکھتے ہوئے غلط تاریخ کا پڑھانا۔
۴۔ مغرب اور مغربی ایجنٹوں کے معائب اور زیادتیوں کو چھپانا۔
۵۔ اسلامیات کو مسلمان اور مسلمان طلباء کے سامنے محض ایک نظری چیز بنادینا۔
۶۔ جغرافیائی اور سیاسی تقسیمات کا پختہ کرنا۔

مسلم دنیا کے تعلیمی نظام کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے انہوں نے طرح طرح کی سازشیں، پروپیگنڈے اور اقدامات کئے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر یونیسکو اور یونیسیف جیسے نام نہاد علمی اور ثقافتی اداروں کا قیام۔

۲۔ مسلم دنیا میں مغربی اداروں کے تحت ٹیچرز ٹریننگ کا پروگرام۔

۳۔ تعلیمی شعبوں میں غیر ملکی امداد و تعاون۔

۴۔ مسلم دنیا کی تعلیمی وزارتوں پر غیر ملکی ماہرین تعلیم کی اجارہ داریاں۔

۵۔ مسلم درس گاہوں میں غیر ملکی مدرسین اور دانش وروں کی مسلسل آمد ورفت۔

۶۔ ذہین مسلم طلباء کے لئے تعلیمی اسکالرشپ کا بندوبست۔

یوں ان سازشوں اور اقدامات کے نتیجے میں ہمارے نظام تعلیم پر درج ذیل اثرات مرتب ہوئے ہیں:

۱۔ ہمارے اکثر طلباء برائے نام مسلمان رہ گئے ہیں۔

۲۔ ہمارے مسلم نوجوانان عمومی طور پر علم دین سے متنفر ہو گئے ہیں۔

۳۔ علم دین اور عصری علوم کے راستے الگ الگ ہو چکے ہیں۔

۴۔ مسلمانوں کے ارباب اقتدار دن بدن دین سے دور ہو گئے ہیں۔

۵۔ مسلمان اپنی علمی وراثت سے بے گانے ہو گئے ہیں۔

۶۔ علمی، تمدنی اور سیاسی قیادتیں مغرب زدہ ہو گئیں۔

۷۔ مسلم معاشرے میں دین اور اہل دین کا مذاق اڑانا معمول بن گیا۔

۸۔ مسلمانوں کی جدید نسل ذہنی طور پر مغرب کی غلام بن گئی۔

یہاں مذکورہ ساری چیزیں اس لئے سامنے لائی گئی ہیں کہ مسلمان علمائے کرام اور مدارس دینیہ کے ارباب بست وکشاد اسلام اور مسلم دشمن سازش کاروں کے ان سازشی اقدامات اور سرگرمیوں سے باخبر رہ کر وہ اپنے نصاب درس اور نظام تعلیم کی اصلاح اور درستگی کے دوران صحیح اور برمحل فیصلوں کے بعد پروگرام، منصوبہ بندی اور لائحۂ عمل کی تیاری میں خاذق اور حاضر دماغی کے ساتھ کام کر سکیں، اور اپنے فیصلوں پر عملی اقدامات کرنے کے دوران کسی قسم کی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اللہ تعالی سے دعا ہے وہ اپنے خاص فضل وکرم سے ہمیں دین اور علم دین کی خدمات کی توفیق عنایت کریں۔آمین. وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔

(جاری اور زیر نظر ہے)

مصنف کی بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف:

سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی	سازش کا طوفان عقلیت و مادیت کے روپ میں
روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے	تذکرۂ علامہ سید الامینؒ
تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ	روہنگیا مسلمان اور ان کی ہجرت کے اسباب
ارکان کے عظیم شاعر علاول، حیات وکارنامے	ارکان روہنگیا یونین، ماضی اور حال کے تناظر میں
روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)	تذکرۂ رفتگان
وادئ پرخار کے گمنام مسافر	سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ
سرخیل کارواں	علماء اور جمعیۃ علمائے اسلام ارکان
روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ	روداد سخن
خورشیدِ تاباں	کاروان انسانیت
سفر اور کامیابیاں	اارکان کے چند ندوی فضلاء ایک نظر میں
عظیم ارکانی لیڈران	علماء اور جمعیت علمائے ارکان
مقالاتِ طاہر ندوی	روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ
مدارس اسلامیہ کا نصاب ونظام اور جدید تقاضے	دو نظام تعلیم
ارکان کے روہنگیا مسلمان موت وحیات کی کشمکش میں	ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO)
برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ	شعرائے ارکان
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۲)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۳)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۴)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۵)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۶)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۷)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۸)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۹)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱۰)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱۱)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱۲)